نئے ادب کے معمار

ساحرِ لدھیانوی

از

کیفی اعظمی

کتب پبلشرز لمیٹڈ
بمبئی

سنہ ۱۹۴۸ء

قیمت

پندرہ آنے

فیروز مستری نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳
سے چھپواکر، کتب پبلشرز لمیٹڈ رنگل بلڈنگ اپالو بندر
بمبئی ۱ سے شائع کیا

ساحر لدھیانوی ۵

انتخاب ۳۷

آج کل فلمی دنیا پر جتنے خطرات منڈلا رہے ہیں، ان میں ساحرلدھیانوی سب سے شدید ہیں۔ معلوم نہیں گیت لکھتے لکھتے وہ کس وقت پروڈیوسر اور ڈائرکٹر ہو جائیں، ان کا یہ رجحان خاص بمبئی کی پیداوار ہے۔ جب میں پہلی بار ان سے ملا تھا اس وقت وہ صرف شاعر تھے اور غالباً جب آخری بار ملوں گا اس وقت بھی وہ صرف شاعر ہی رہیں گے، اس لئے نہیں کہ ان کی صلاحیتیں شاعری تک محدود ہیں مگر اس کو کیا کیجیے کہ ڈائرکٹری، پروڈیوسری یا اس نوع کے کسی شعبے میں اتنی قوت نہیں کہ وہ ساحر کو مستقلاً زیر کر سکے۔

درمیانی طبقے کے عام "اسکیم باز" نوجوانوں کی طرح ساحر بھی کسی نقطے پر ٹھہر نہیں سکتے، چلتے رہنا، چلتے ہی رہنا ان کا مقصد ہے وہ بھی سیدھے خط پر نہیں کا ٹلکتے ہوئے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے زندگی کی تلخ حقیقتیں

ان کا پیچھا کر رہی ہیں وہ بھاگنا نہیں چاہتے مگر بھاگ رہے ہیں ان کے سامنے ایک وسیع میدان ہے، ایک روشن منزل ہے مگر وہ فرلانگ لانبی سڑک، کیسے طے کی جائے جس پر ساحر کے جانے پہچانے ہزاروں نوجوان اپنے کاندھوں پر اپنا بوجھ لئے ٹہل رہے ہیں، گھوم رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، ان کی رفتار کا دائرہ روز بروز سمٹ رہا ہے اور وہ اپنے ہی چکر میں پھنسے جا رہے ہیں۔

کالج میں طلبا کی تنظیم سے ساحر کی جو عملی وابستگی تھی وہ کالج سے نکلتے ہی ہمدردی سے بدل گئی اور زندگی کی ان مجبوریوں نے ان کو بُری طرح دبوچ لیا جو کسی کو مات دیدیتی ہیں، کسی سے مات کھا جاتی ہیں۔

زندگی کیسے گذاری جائے؟ یہ ایک بار سبھی کو سوچنا پڑتا ہے مگر ہمارے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا مسئلہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے، ان کے سامنے بہ یک وقت دو سوال آتے ہیں، زندہ کیسے رہا جائے؟ اور اپنے رجحانوں کو پروان کیسے چڑھایا جائے؟ بیکاری میں زندگی مشکل ہے، کلرکی میں رجحانوں کا پنپنا ناممکن۔

ساحر نے اپنی نظموں کا مجموعہ مرتب کیا اور اس کو فروخت کرنے نکلے شاید اس موقع پر ان کے ذہن میں تصنیف و تالیف کے سہارے جی لینے کا منصوبہ ہو۔ لیکن جب ایجنٹوں کو ۲۵ اور ۳۳ فیصدی کمیشن اور مصنفوں کو ۱۲ یا ۱۵ فیصدی رائلٹی ملتی ہو تو سوچنا پڑتا ہے کہ کتاب لکھی جائے یا کتاب بیچی جائے۔

ساحر کو ایک مشکل اور پیش آئی ہوگی کہ ان کی کتاب خریدے کون ؟ چھاپے کون ؟ وہ لاکھ ہونہار شاعر سہی مگر اتنے مشہور کہاں تھے جس سے ہمارے ناشر صاحبان متاثر ہوتے ہیں، ان کے کلام کی بازار میں اتنی مانگ کہاں تھی کہ خادمانِ زبان و ادب خاطر خواہ نفع کما سکیں۔ پریت لڑی نے بڑا حوصلہ کیا کہ کتاب چھاپ دی۔

یہ ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے، اس سے پہلے میں م۔ حسن لطیفی کے علاوہ لدھیانے کے کسی شاعر کو نہیں جانتا تھا۔ جب "تلخیاں" کی ایک جلد قومی جنگ (یا زمانہ بمبئی) میں تبصرے کے لئے آئی اور میں نے اس کا مطالعہ کیا تو خوشی بھی ہوئی، حیرت بھی۔ خوشی اس امر کی کہ ساحر کی شاعری اس الجھاؤ، ابہام اور بے روح لذتیت سے پاک تھی جس کو جنگ کے زمانے میں نوجوان شعرا نے اپنا فن بنا لیا تھا۔ اور حیرت یہ ہوئی کہ ایسا ہونہار شاعر اب تک کہاں چھپا ہوا تھا۔

میں نے ارادہ کیا کہ ساحر کو خط لکھوں گا اور مبارک باد دوں گا لیکن نہ خط لکھ سکا نہ مبارک باد دے سکا۔ خط تو کاہلی کی وجہ سے نہیں لکھا مبارکباد ڈر کے مارے نہیں دے سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں ایک شاعر نے جو لیڈر بھی بننا چاہتے تھے مجھے اسی حرکت پر بری طرح پھٹکارا تھا۔ میں نہ تو اچھی طرح ان کے منصوبوں سے واقف تھا نہ عقائد سے صرف صاحب سلامت تھی۔ ایک دن سرِراہ سے ملاقات ہوگئی، لا کے نتائج آ چکے تھے اور انھوں نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ میں نے مزاج پرسی کے بعد اس کامیابی پر

مبارک باد دیدی اور وہ بھڑک گئے " مجھے آپ کی مبارک باد نہیں چاہئے"
میں سمجھا کہ شاید مجھ سے بھول ہوا یہ کامیاب نہیں ہوئے اور میری مبارکباد
کو طنز سمجھ رہے ہیں ان کے متعلق ایسا سوچنا قرین قیاس بھی تھا۔ میں
معذرت کرنے لگا کہ معاف فرمایئے گا۔ میں نے سنا ہی تھا کہ آپ کامیاب
ہو گئے ہیں۔

اب انھوں نے سینے سے لپٹی ہوئی چادر کی سلوٹیں دور کیں اور
کھدر کی ٹوپی ماتھے پر کچھ اور کج کر کے تقریر کرنے لگے ، سنا آپ نے صحیح
ہے ، مگر نہ تو آپ کی تہنیت میں کوئی خلوص اور نہ مجھے اتنی فرصت کہ
رسمی مبارکبادیں لیتا پھروں ، کل ہی ناگپور سے ایک کانفرنس کی صدارت
کر کے پلٹا ہوں ، وہاں بھی ہزاروں آدمی مبارک باد دینا چاہتے تھے مگر
میں نے سب کو روک دیا ، مجھے یقین ہے کہ جب تک ہندستان آزاد
نہیں ہوگا اس وقت تک نہ ہم کو وقت کی قدر ہوگی نہ ہم رواج سے چھٹکارا
پائیں گے ۔

وہ بے تکان بول رہے تھے اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا ،
کس مصیبت میں پھنس گیا ۔ اتنے میں کاندھے پر سے ان کی چادر
ڈھلک گئی اور مجھے موقعہ مل گیا " یہ تو سچ ہے کہ میری نیت میں خلوص
دلوص نہیں تھا میں خلوص کے بیجا استعمال کا قائل بھی نہیں ہوں آپ کو
مبارک باد اس لئے دی تھی کہ شاید ہندستان کی آزادی کے بعد آپ سے
کوئی غرض وابستہ ہو جائے ۔ اگر مصلحت اندیشی کو آپ رواج پرستی سمجھتے

ہیں تو خدا حافظ "۔

انھیں دنوں کسی رسالے میں شورش کاشمیری وغیرہ کے ساتھ ساحر کی ایک تصویر شائع ہوئی تھی اس میں یہ حضرت بھی کافی طرحدار معلوم ہوتے تھے۔ میں نے سوچا مبارک باد بھیج کے کون خطرہ مول لے۔ لیکن جب ان کی دو تین نظمیں قومی جنگ میں چھپنے کے لئے آئیں تو ایک گونہ قربت سی محسوس ہونے لگی اور ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ ملاقات ہو کیسے؟ میں بمبئی میں وہ لاہور میں۔ مگر یقین تھا کہ کسی نہ کسی حیثیت سے ایک دن ان کو بمبئی آنا ہی پڑے گا۔

بمبئی ہمارے ملک کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے، اس لئے ادبی مرکز بھی روٹی اور ادب کا تعلق یہاں بہت واضح ہے۔ یادش بخیر دلّی اور لکھنو کی مرکزیت مسلم۔ مگر ہر شخص کے سامنے آج سب سے پہلا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ ؎ ۔

ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں۔ کھائیں گے کیا؟

اس "کھائیں گے کیا؟" کو تحت غم الفت کے پردے میں کب تک چھپایا جا سکتا ہے آج اردو کے اکثر نامور ادیب اور شاعر، شمالی ہند سے آکر بمبئی میں براجمان ہیں۔ میر کی طرح بعض کو یہاں ہر وقت اپنی زبان کے بگڑ جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے مگر غذائی زنجیر ڈھیلی نہیں پڑتی۔ وہ ادب اور آرٹ کی تخلیق کے لئے ہر خارجی تقاضے کو بیجا سمجھتے ہیں۔ مگر فلم پروڈیوسروں کی تحکم آمیز فرمائشیں کون ٹال سکتا ہے۔

نگاہ ملتے ہی چتون کڑی نہیں رہتی
بڑوں کی بات بھی اس جا بڑی نہیں رہتی (آرزو)

اور ساحر کو بھی بمبئی آنا پڑا۔

ساحر سے میری پہلی ملاقات حیدر آباد کے اسٹیشن پر ہوئی۔ وہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس تھی اور بمبئی سے ایک اچھا خاصا قافلہ روانہ ہوا تھا۔ اسی قافلے میں میں بھی تھا۔ جب ہم لوگ حیدر آباد اسٹیشن پر اترے تو کلیم اللہ نے خبر دی کہ دوسری ٹرین سے جو پانچ منٹ میں آنے والی ہے ساحر آرہے ہیں۔ میں کانفرنس کے رضاکاروں کے ساتھ ساحر کے استقبال کے لئے وہیں ٹھہر گیا۔

ٹرین آئی اور ساحر لڑھکتے لچکتے ہوئے اپنے ڈبے میں سے پلیٹ فارم پر آرہے۔ ساڑھے پانچ فٹ کا قد۔ جو کسی طرح سیدھا کیا جا سکے تو چھ فٹ ہو جائے۔ لانبی لانبی لچکیلی ٹانگیں، پتلی سی کمر، چوڑا سینہ، چہرے پر چیچک کے داغ، سرکش ناک، خوبصورت آنکھیں، آنکھوں میں جھنپا جھنپا سا تفکر، بڑے بڑے بال، ڈھیلی چال جسم پر قمیص، پتلون مُڑی ہوئی اور ہاتھ میں سگرٹ کا ٹن۔

میں نے بڑی بے تابی سے بڑھ کر اپنا نام بتایا اور ساحر دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھ پر ڈھے پڑے۔ میں خود بھی مصافحے سے بغلگیری میں زیادہ کیف پاتا ہوں مگر اس وقت کچھ گھبرا سا گیا کہ بے چارے کو کہیں چکر تو نہیں

آگیا ہے کچھ طبیعت تو نہیں خراب ہے، مزاج پرسی کرنے ہی والا تھا کہ انھوں نے بغیر کچھ کہے ہوئے سگریٹ کا ٹن میری طرف بڑھا دیا اور میں نے محسوس کیا کہ اب ان سے کچھ ان کے متعلق کہنا یا پوچھنا اس بے تحاشہ خلوص کی توہین ہے۔ لیکن خاموشی تو توڑنی ہی تھی۔ میں نے پوچھا، کیوں قاسمی صاحب کیوں نہیں آئے اور وہ دو لفظوں میں جواب دے کے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

ہم لوگ وہاں سے چل کر جھڑتی نا کے دھنگی، پہونچے۔ یہاں ہمارے بکس کھلوائے گئے۔ بستر ٹٹولے گئے "تخلصات"، رجسٹر میں درج ہوئے اس اثنا میں فراق صاحب جو ہماری ہی گاڑی میں تھے اور ساحر دونوں کی سراسیمگی اس قدر قابل رحم تھی کہ خود جھڑتی نا کے کے ایک کارندے نے بڑھ کر فراق صاحب کو تسلی دی "مولی صاحب یہ ہماری ریاست کا قاعدہ ہے آپ گھبراؤ نہیں"۔ یہیں میں نے پہلی بار ساحر کی ہنسی دیکھی۔ وہ نہ مسکراتے ہیں نہ قہقہہ لگاتے ہیں بلکہ ان کو ہنسی کا اُچھو ہوتا ہے اور اس اُچھو کے ساتھ ہی شرم کی بھی ایسی لہر آتی ہے کہ آس پاس والے بھی غرق ہو جائیں۔

جائے قیام پر پہونچ کر فراق صاحب اپنا کلام سنانے میں اور کچھ لوگ نہانے دھونے میں مصروف ہو گئے ہم دونوں اس کمرے میں جا کر فرش پر لیٹ رہے۔ جہاں مہمانوں کا سامان رکھوایا گیا تھا۔

ان دنوں قومی جنگ کے ادارے میں ایک رفیق کی ضرورت تھی

اور میں وہاں ساحر کو کھینچنا چاہتا تھا مگر اپنا ارادہ ظاہر کرنے سے پہلے ان کے مسائل، ان کے مشاغل اور منصوبوں سے واقف ہونا ضروری تھا، حالانکہ درمیانی طبقے کے کسی نوجوان کی زندگی دیکھ لیجئے آپ اس کو اپنی زندگی سے زیادہ مختلف نہ پائیں گے۔

ساحر کی سرگذشت بھی کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں نکلی۔ لدھیانے کے ایک جاگیردار کے چشم و چراغ ہیں، ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کرکے جب کالج میں پہونچے تو دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ کالج سے باہر نکلے تو ضرورت کی تمام چیزیں چور بازار میں پہونچ چکی تھیں اور ہندستان کے پوربی حصے میں اتنا بڑا کال پڑا تھا کہ تیں لاکھ انسان ایڑیاں رگڑ کے مر گئے۔ اور جب لدھیانے، لاہور اور کٹک وغیرہ سے مایوس ہو کر بمبئی آئے تو یہاں ہندو مسلمان ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ ان حالات میں زندگی جو شکل قبول کرتی ہے وہ ہمارے لئے اجنبی نہیں، مگر ساحر کی داستان میں ایک نیا باب بھی ہے۔

ان کے والد بزرگوار نے اب تک گیارہ شادیاں کی ہیں، ساحر ابھی کمسن ہی تھے کہ ان کی ماں اور والد کے تعلقات خراب ہو گئے اور ایک نئی نزاع پیدا ہو گئی کہ ساحر کس کے پاس رہیں، جاگیردار باپ کو ایک ولی عہد کی ضرورت تھی اور بدقسمتی سے ساحر کے علاوہ ان کی کوئی دوسری اولاد نہیں ہے اس لئے انھوں نے گھر کا جھگڑا کورٹ میں پہونچا دیا۔ ساحر مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے اور انھوں نے ماں کے پاس رہنے کی

خواہش ظاہر کی۔ اب ساحر کے والد کو ان سے کیا دلچسپی رہ سکتی تھی، "خون اور روح کے رشتے" روز بروز جھول کھاتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب ساحر نے پڑھنا شروع کیا تو ان کے والد نے اپنی بڑی توہین محسوس کی کہ اتنے بڑے جاگیردار کا بیٹا اسکول کیوں جاتا ہے اور جب انھوں نے یہ سنا کہ ان کا ولی عہد عبدالحیٔ سے ساحر ہو گیا ہے اور شعر کہتا ہے تو غصہ نفرت سے بدل گیا۔ لیکن جب یہ خبر ملی کہ لدھیانے کا مجسٹریٹ ساحر کی شاعری پسند کرتا ہے اور اپنی موٹر بھیج کے ان کو بلواتا ہے تو ایک بار پدرانہ محبت پھر جاگ اٹھی اور انھوں نے ادھر اُدھر کہنا شروع کیا۔

"عبدالحیٔ بڑا اچھا شاعر ہو گیا ہے وہ مجسٹریٹ صاحب کے بنگلے میں چلا جاتا ہے"

مگر عبدالحیٔ صاحب باپ کی دولت سے فیضیاب پھر بھی نہ ہو سکے۔ ان کو تعلیم ماں اور ماموں نے دلوائی۔ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد زندہ رہنے کے لئے اپنے فن، اپنی شاعری اپنے احساس کو چاندی کے ترازو میں تلوانا پڑا۔

ساحر قومی جنگ کے ادارے میں بڑی خوشی سے آنے کو تیار تھے۔ مگر ضعیف ماں کو کس پر چھوڑتے۔ مجبوراً صرف بمبئی کی تفریح کا پروگرام بن سکا۔

یہاں تفریح کے ہزاروں سامان اور ہزاروں مقامات ہیں لیکن وہ شہر کے کس حصے میں ہیں اور وہاں پہونچا کیسے جائے۔ میں اسی فکر میں

تھا کہ ساحر نے میری مشکل اپنی فرمائش سے آسان کردی کہ میں یہاں کی مزدور بستیاں دیکھنا چاہتا ہوں .. ان بستیوں میں جانا اور ساحر کو لے جانا میرے لئے کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا۔

قومی جنگ کے ذریعے بمبئی کے مزدور ساحر کے نام سے واقف ہو چکے تھے۔ جب مدن پورہ کے نوجوانوں کو ان کے آنے کی خبر ملی تو ان میں سے بعض ساتھی پارٹی آفس آئے اور ساحر کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دے گئے۔

مدن پورہ بمبئی کے محنت کش مسلمانوں کا علاقہ ہے، اس علاقے کے جنگ جو مزدوروں کا سیاسی، سماجی، معاشی اور طبقاتی شعور بہت بیدار ہے وہ سرخ جھنڈے کی رہنمائی میں سرمایہ داروں سے بارہا ٹکرا چکے ہیں، انھوں نے قومی تحریک کو بھی اپنا خون دیا، ٹریڈ یونین تحریک کو بھی اور اب ترقی پسند ادب کی تحریک میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔

وہ جان گئے ہیں کہ بالادست طبقے نے اُن سے ذرائع پیداوار کے ساتھ ساتھ نظیر اور پریم چند کو بھی چھین لیا ہے۔ اسی لئے ان کی جدوجہد مہنگائی بھتے اور بونس تک محدود نہیں وہ تہذیب و تمدن کا غصب شدہ سرمایہ بھی واپس مانگ رہے ہیں۔ نوجوان پارٹی کے نام سے انھوں نے اپنی ایک انجمن بنائی ہے۔ اس انجمن کی اپنی ایک لائبریری، مطالعہ گھر ہے، ہر سال ایک بڑا مشاعرہ بھی ہوتا ہے جس میں مزدور شعرا کے علاوہ مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی۔ ساغر نظامی، مجاز، مخدوم محی الدین، مجروح

نظر حیدرآبادی، شاہد صدیقی اور سردار جعفری ایسے نامور شعرا بھی برابر شریک ہوتے رہے ہیں۔

میں ساحر کو لے کر مقررہ وقت پر مدن پورہ پہونچا۔ بیس پچیس نوجوان ایک گلی میں ٹاٹ بچھائے بیٹھے تھے، ساحر کے لئے اسی ٹاٹ پر انھوں نے تو شک اور تو شک پر سفید چادر بچھا رکھی تھی، ساحر کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو گئے۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے کہہ رہے تھے۔ ساحر صاحب آیئے اب تک آپ جن مجلسوں میں تھے ہم وہاں آ نہیں سکے، ہم وہاں آنا چاہتے بھی نہیں۔ اس لئے ہم نے خود آپ کو بلوا لیا، اس تنگ و تاریک بستی میں آپ کا دم تو نہیں گھٹتا۔ یہاں کارپوریشن کے کارندے کبھی نہیں آتے لیکن پولیس روز آتی ہے، یہاں قومی رہنما صرف الکشن کے موقع پر آتے ہیں لیکن وبائیں ہر موسم میں آتی ہیں۔ مگر آپ نہ جھجکئے آپ یہاں پائیں گے بہت کچھ، کھوئیں گے کچھ نہیں، ہم آپ کو اپنا آلۂ تفریح نہیں بنائیں گے ہم محنت کش ہیں، ہم مزدور ہیں۔

اور میں نے محسوس کیا کہ ساحر کسی سوچ میں پڑ گئے۔ ہمارا بڑے سے بڑا ادیب جب مزدوروں کے کسی جلسے میں پہونچتا ہے تو اس کو پسینہ آ جاتا ہے، کون ہے جس نے یہ نہ سوچا ہو کہ میرے فن میں وہ صداقتیں کہاں جو زندگی میں ہیں، میرے آرٹ میں وہ تنومندی کہاں جس کو محنت جنم دیتی ہے۔ میرے تصور میں وہ خلوص کہاں جو جدوجہد سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک بار فکر و تخیل کی پرشکوہ مگر کھوکھلی تعمیر زمین پر آ رہتی ہے۔ کچھ لوگ مزدوروں کو

ناسمجھ کہہ کر پھر اپنی انانیت کو فریب دے دیتے ہیں۔ کچھ لوگ آئندہ اپنے فن کو نیا روپ دینے کی نیت باندھ لیتے ہیں۔

مگر ساحر کا معاملہ کچھ اور ہی تھا غالباً اس وقت اُن کو شعر و سخن کی وہ مجلسیں یاد آ رہی تھیں جو کسی بڑے خوبصورت ڈرائنگ روم میں منعقد ہوتی ہیں خواب آور صوفے، ریشمی قالین، بے داغ دیواروں پر آویزاں نیم برہنہ تصویریں، شیشے کی الماریوں میں محبوس اقبال اور ٹیگور کی روحیں۔ پینے کے لئے بہترین شربت، بہترین چائے، بہترین سگریٹیں، کھانے کے لئے بہترین کیک، بہترین پیسٹری، بہترین پھل ——— مگر زندگی ———

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

میں نے لوگوں سے ساحر کا تعارف کرایا اور انھوں نے اپنی نظمیں سنانا شروع کیں — "مجھے سوچنے دے" "چکلے"، "تاج محل" شارعِ فردا، بنگال، طلوعِ اشتراکیت، اجنبی محافظ، احساسِ کامراں، ایک کے بعد دوسری نظم پڑھی جا رہی تھی اور نوجوان مزدور خوش تھے، وہ اپنی زبان، اپنی نظر، اپنے چہرے اور اپنی تمام حرکات سے ساحر کو داد دے رہے تھے۔

دو تین گھنٹے کی نشست کے بعد جب ہم لوگ واپس ہوئے، تو ساحر گنگنا رہے تھے۔

احساس بڑھ رہا ہے حقوقِ حیات کا
پیدائشی حقوقِ ستم پروری کی خیر

انساں الٹ رہا ہے رخِ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمامِ فسوں پروری کی خیر

رات کو سونے سے پہلے مجھ کو ساحر نے اور میں نے ساحر کو یاد دلایا کہ صبح پریل چلنا ہے۔ پہلے پارٹی آفس میں رفیقوں سے ملیں گے اور گھات لگ گئی تو کوئی کارخانہ بھی دیکھ لیں گے مگر ساحر کی صبح حسب دستور ۱۲ بجے دن کو ہوئی اور وہ خدا خدا کر کے بیدار ہوئے۔

ان کے سو کے اٹھنے کی ادا عجیب و غریب ہے، ایک سیلی سی انگڑائی لینے کے بعد گھٹنے سمیٹ کر پنجوں کے بل بستر پر بیٹھ جاتے ہیں، الجھے الجھے بال، سرخ سرخ آنکھیں اور آنکھوں میں یہ تنبیہ کہ "کسی نے چھیڑا تو پھر سو جاؤں گا"

بیس پچیس منٹ تک اسی انداز سے بیٹھے چپ چاپ کسی ایک طرف دیکھتے رہتے ہیں، اس کے بعد اٹھنا شروع کرتے ہیں، پہلے کمر سے اوپر کا حصہ سیدھا ہوتا ہے، پھر گھٹنوں، اور گھٹنوں کے بعد پنڈلیوں پر دباؤ پڑتا ہے اور اس طرح وہ تین قسطوں میں اٹھ جاتے ہیں۔

دوسرے دن ہم لوگ کامریڈ امتیاز خاں کے ساتھ گھاٹ مزدوروں سے ملنے گئے، اتفاق سے وہ بھرتی کا دن تھا اور ہزاروں مزدور دھوپ میں قطار باندھے کھڑے تھے، ان میں گوانی بھی تھے، پنجابی بھی اور پٹھان بھی

اکثر سارا سارا دن یونہی گذر جاتا ہے اور بھرتی نہیں ہوتی، بھرتی ہو بھی تو کام مل جانا یقینی نہیں۔ دلال آتا ہے پورے ہجوم میں سے چند فربہ اور تندرست نوجوانوں کو ٹھونک بجا کر چن لے جاتا ہے، ان سے خاطر خواہ رشوت لیتا ہے پھر وہ گھاٹ سارنگوں کے سامنے کھڑے کئے جاتے ہیں۔ جو خوش قسمت وہاں بھی انتخاب میں آجاتے ہیں اُن کو گھاٹ سارنگوں کی مٹھیاں گرم کرنا پڑتی ہیں۔ اس کے بعد گھاٹ ہے سمندر ہے، جہاز ہے اور اعضا شکن مشقت، مگر حقوق کچھ نہیں۔

اس اندھیر نگری میں پہلی بار امتیاز مرحوم لال جھنڈا لے کر پہونچے تھے اور مزدوروں کو منظم کر رہے تھے۔ ہم لوگ تقریباً چار گھنٹے مزدوروں کی کس مپرسی، تباہ حالی اور لوٹ کھسوٹ کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے اور گھاٹ سارنگوں، دلالوں کی خونی نظریں امتیاز کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ امتیاز کے خون کے پیاسے تھے انھوں نے ایک دن امتیاز کا خون پی بھی لیا

ساحر اس دن بہت متاثر تھے، ان کی آنکھوں سے، چہرے سے سکوت سے، دلالوں، گھاٹ سارنگوں اور ان انسانیت سوز نظام کے لئے نفرت برس رہی تھی، ایسے موقعے پر وہ عموماً کچھ دیر کے لئے خاموش ہوجاتے ہیں پھر اچانک، سماجی پس منظر، معاشی تعلقات، اور طبقاتی شعور ایسی اصطلاحوں کا سہارا لے کر بولنے لگتے ہیں: "کچھ نہیں، ایمان سے دیکھتے ہو۔ یہاں مزدوروں کی یہ حالت ہے اور قومی رہنما فرماتے ہیں، کمیونسٹ ہڑتال کرواتے ہیں !!۔

ایک غیر سنجیدہ ماحول میں جہاں ہر چیز کا مذاق اڑا دیا جاتا ہے زندگی کے پچیس برس گذارنے سے ساحر کی فکر نے دفاعی انداز اختیار کر لیا ہے وہ کسی چیز کو اس کے اثباتی زاویے سے دیکھنے اور دکھانے کے عوض اس زاویے سے دیکھنے اور اس کی تردید کرنے لگتے ہیں جو گمراہ کن ہو۔

اسی نظم میں جس کو میں ان کی شاعری کا نیا منشور سمجھتا ہوں جب وہ مزدوروں سے یہ عہد کرتے ہیں کہ "میرے گیت تمہارے ہیں" تو فوراً ان کے سامنے درمیانی طبقے کے کھوکھلے نقاد آجاتے ہیں اور ساحر کو کہنا پڑتا ہے

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے لوگ مجھے فنکار نہ مانیں
فکر و سخن کے تاجر میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں

یہ نظم انھیں تزغیبات کا نچوڑ ہے، جو ساحر کو مزدوروں کی زندگی سے حاصل ہوئیں۔ وہ جاتے جاتے مجھ سے وعدہ کر گئے کہ میں بہت جلد کوئی صورت نکال کر بمبئی آجاؤں گا۔ اور قومی جنگ کے ادارے میں کام کروں گا۔ مجھ کو یقین تھا کہ وہ اپنا وعدہ بھولے نہ ہوں گے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ اپنی ساری نظمیں ان کو یاد ہیں۔ مجاز، فیض، عبدالحمید عدم، الطاف مشہدی اور دوسرے شعرا کے ہزاروں شعر ان کو یاد ہیں، شورش کاشمیری کی تقریریں دیوندر ستیارتھی اور متل کے لطیفے یاد ہیں۔ شیریں فرہاد کا پورا ڈرامہ اور وہ ہزاروں جملے یاد ہیں جو اب تک ان کی تعریف یا برائی میں کہے یا لکھے گئے ہیں۔ وہ بمبئی آنے کا وعدہ بھی نہیں بھولے۔ ہاں کمیونسٹ ہیڈکوارٹرز

میں آنے کے بجائے ہندستانی کلا مندر میں آئے۔ گھریلو زندگی کی پابندیوں نے پھر ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

"میرے گیت تمھارے ہیں" میں ساحر نے عوام سے یہ کہا تھا

تم سے قوت لے کر اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا

تم پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا

ساحر کی ساری الجھنوں کا سبب یہی "تقسیم عمل" ہے وہ بربط پر گانا اس لئے چاہتے ہیں کہ پرچم لہرانے والوں کے رگ پٹھوں میں خون تیزی سے گردش کرتا رہے۔ مگر خود اپنے دست و بازو میں اتنی طاقت نہیں پاتے کہ گاتے بھی رہیں، پرچم بھی لہراتے رہیں۔

اس معاملے میں ترقی پسند ادیب دو رائیں رکھتے ہیں، بعضوں کا خیال ہے کہ دنیا کی موجودہ کشمکش میں ترقی پسند قوتوں کی حمایت ضرور کرنی چاہیے مگر کسی قسم کی عملی وابستگی فن کے لئے مضر ثابت ہوگی اور بعضوں کا خیال ہے کہ ان ترقی پسند قوتوں سے علاحدگی ہی فن کی موت ہے۔ ساحر پہلے گروہ کا ساتھ نہیں دیتے وہ جانتے ہیں کہ تنہائی آرٹ کی سب سے بڑی دشمن ہے، جدوجہد، فتح و شکست، جزر و مد، کشمکش، دبال، شدت، محنت، مشقت اور حرکت کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے اور زندگی کے بغیر آرٹ کی تخلیق ناممکن۔ اجتماعی ہنگاموں سے بھاگ کے جو فن کار اپنی ذات میں قلعہ بند ہو جاتا ہے، اس کا فن ایک دائرے میں اور دائرہ نقطے میں

تحلیل ہوتا رہتا ہے، اپنے بوجھ کے نیچے دبے چیختے رہیئے کہ تنگ نظرو میں پراگمنڈہ نہیں کروں گا، میں نعرہ زنی نہیں کروں گا، میں سچا آرٹسٹ ہوں، میرے نغمے میں آفاقیت، ابدیت و یوبالیت ہے، مگر رواں دواں قافلہ آگے بڑھتا جاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک اضمحلال، افسردگی، تھکن اور مایوسی چھوڑ جاتا ہے۔ اس فضا میں نمو نہیں، حرکت نہیں، تازگی نہیں، ترغیب نہیں، آہنگ و رنگ نہیں، تخلیق کیسے ممکن ہے۔

ساحر اسی رواں دواں قافلے کے ساتھ ہیں لیکن جب وہ باہر نکلنے کے لئے اپنی ذات کا دائرہ توڑنے لگتے ہیں تو کہیں سے ایک حسین جمیل کار آکر ان کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔

یہ کار جب تک خوش حالوں کے موٹر خانے سے باہر نکالی نہیں جائے گی درمیانی طبقے میں اس کی پرستش ہوتی رہے گی اور ہمارے نوجوان ادیب اور شاعر اس کے پیچھے دوڑتے رہیں گے۔ ساحر کے ذہن میں اس کار نے گتھی ڈال دی ہے وہ کم سے کم ایک بار یہ کار ضرور حاصل کرنا چاہتے ہیں عیش کوشی کے لئے نہیں، بورژوا طبقے کو زک دینے کے لئے۔ ان لوگوں سے انتقام کے لئے جنھوں نے "مادام" کی مجلس میں ان کی مفلسی کا مذاق اڑایا تھا۔ اسی ندرا ہے پر، گردانے کے لئے جہاں ان کو بار بار قسم کھانا پڑی ہے کہ

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا

اس بنگلے کے سامنے ہارن بجانے کے لئے جہاں اُن کی محبوبہ اپنی نظروں کا حجاب، اپنے لبوں کی بھیگی سلوٹیں، چہرے کا تبسم،

اور سینے پر مخروطی اٹھائیں لئے ہوئے کار پر بیٹھ کر چلی گئی اور ان کو دل تھام کر مصور سے یہ فرمائش کرنی پڑی۔

گمرہاں زیخ تمکے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں میرے بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

اسی لئے انھوں نے پرچم اپنے ساتھی کے کاندھے پر رکھ دیا ہے اور بربط خود اٹھالیا ہے۔ پرچم تو لہراتا رہے گا، کاش بربط بھی بجتا رہے اور ساحر گاتے رہیں۔ مگر اس منزل میں دل دھڑکتا ضرور ہے۔ زندگی بڑی بے درد ہے اس نے اس انقلابی دور میں ایسے ہزاروں ہاتھوں سے بربط چھین لیا ہے جن کے کاندھوں پر پرچم نہیں تھا۔

فکر و عمل کے اسی تضاد نے ساحر کی زندگی میں نراجیت اور فن میں افسردگی پیدا کر دی ہے، وہ باپ کی جاگیر ہو یا کسی اور کی ساحر زمین کا جائز وارث کسانوں کو سمجھتے ہیں، مگر تلخی زندگی کی محرومیاں اور باپ کی جاگیر پانے کا قانونی حق ان کو بار بار اسی وادی شاداب کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتا ہے، جس کی حقیقت سے ساحر پوری طرح واقف ہیں۔

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعت ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

جن لوگوں نے ساحر کو قریب سے نہیں دیکھا ہے شاید ان کو یہ معلوم ہو کہ اپنے ماحول سے مایوسی اور ترقی پذیر قوتوں سے دوری نے ساحر کے مزاج میں بے انتہا شک پیدا کر دیا ہے۔ پروڈیوسر تنخواہ بڑھا دے تو سوچنے لگتے ہیں، کوئی خاص بات تو نہیں ہے کوئی لڑکی سلام کرے تو فکر پیدا ہو جاتی ہے کہ میری ناکامیوں میں کوئی اضافہ تو نہیں ہونے والا ہے اور کوئی لڑکی واقعی محبت کرنے لگے تو دل دھڑکنے لگتا ہے کہ

تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت
در حقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم، تری عادت ہی نہ ہو

اور یہ تشکیک کسی بدنفسی کا نتیجہ نہیں، بلکہ

آئینۂ حوادثِ ہستی میں میرے شعر
جو دیکھتا رہا ہوں وہ کہتا رہا ہوں میں
دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

کھاتے پیتے گھرانوں میں شاعروں اور آرٹسٹوں کو جس طرح کھلا کے مارا جاتا ہے ساحر بھی اس کے شکار ہوتے رہے ہیں، انھوں نے خلوص، محبت، وفاداری اور عشق کے عہد پیماں کو سکّوں کے دباؤ سے بارہا پارہ پارہ ہوتے دیکھا ہے اور بارہا یہ عہد کیا ہے کہ

کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروازہ کھلا بھی تو پلٹ آؤں گا

مگر زندگی رہتی گھوم پھر کر اسی دوراہے پر ہے، اس لئے ذہن و تصور کے برف برسانے کے باوجود

تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پا کر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

لیکن اب کی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے سمجھنے میں ان کو زیادہ دیر نہیں لگی۔

اپنی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے نہ چھپا
میں اس انداز کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں
تیرے زرکار دریچوں کی بلندی کی قسم
اپنے اقدام کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں

"اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا"
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پر
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی، جھنجھلائی تھی

اس طرح فریبوں اور ناکامیوں کا یہ سلسلہ زندگی کو گھیرتا چلا جاتا ہے۔ محبت کی ناکامی اردو شاعری کا خاص موضوع ہے جس معاشرے میں مردوں، عورتوں کے درمیان اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہوں،

وہاں شب ہجر کا ڈھلنا معجزہ ہی ہوگا، یہی شب ہجر اردو کی پوری عشقیہ شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔

پرانے شعرا کے دیوان کے دیوان دیکھ ڈالئے۔ اس شب ہجر کے پس منظر میں محبوب کی بے وفائی کے سوا کوئی چیز ابھرتی دکھائی نہ دے گی۔ ادھر کچھ نوجوان شعرا نے جو محبوبوں کو بالطبع شریر نہیں سمجھتے یہ دیکھنے کی بھی کوشش کی ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جو محبوبوں کو بے نیازی اور سرد مہری پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس کوشش میں ساحر نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے، وہ ہر چیز کو اس کے مادی پس منظر میں دیکھنے کی وجہ سے صحیح نتائج نکال لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

اگر حسن و عشق بھی اسی مادی دنیا کی چیزیں ہیں — اور وہ ہیں تو مادی حالات ان پر اثر انداز بھی ہو سکتے ہیں — اور وہ ہوتے ہیں۔

سوچتا ہوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اس تمدن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں
سوچتا ہوں کہ محبت ہے اک افسردہ سی لاش
چادرِ عزت و ناموس میں کفنائی ہوئی
دورِ سرمایہ کی روندی ہوئی رسوا ہستی
درگہِ مذہب و اخلاق سے ٹھکرائی ہوئی

اس احساس کا فوری ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ۔

سوچتا ہوں کہ محبت نہ بچے گی زندہ
پیش ازاں وقت کہ سڑ جائے یہ گلتی ہوئی لاش
یہی بہتر ہے کہ بیگانۂ الفت ہو کر
اپنے سینے میں کروں جذبۂ نفرت کی تلاش
اور سودائے محبت سے کنارا کر لوں
دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کر لوں

مگر فوراً حیات کے تقاضے ٹوکتے ہیں۔

زندگی شعلۂ بے باک بنا لو اپنی
خود کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو
کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اور جب جذبات میں ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ سماج، مذہب، تہذیب، دولت اور عزت کی دیواریں عشق ہی نہیں حسن کے سامنے بھی کھڑی ہیں جو صرف جذبات کی تحریک سے ڈھائی نہیں جا سکتیں تو لہجہ بدلنے لگتا ہے۔

زخم خوردہ ہیں تخیل کی اڑانیں تیری
تیرے گیتوں میں تری روح کے غم پلتے ہیں

سرمگیں آنکھوں میں یوں حسرتیں لَو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دیئے جلتے ہیں

دل کی تسکیں بھی ہے آسائشِ ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیست احساس بھی ہے، شوق بھی ہے، درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں

اور جب حسن و عشق کی محرومی پہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں گرد و پیش کا جائزہ لیتی ہیں تو اپنا درد دنیا کے درد کا ایک حصہ نظر آتا ہے اور یہیں سے شعاعِ فردا، جھلکتی ہوئی دکھائی دینے لگتی ہے۔

اور کچھ روز بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک و سم افشاں سہی۔ لیکن جی لے

یہ ساحر کی فکر اور فن کا مخصوص انداز ہے، وہ چھوٹے چھوٹے تجربات کو اس ڈھنگ سے ترتیب دیتے ہیں کہ زندگی کے مختلف روپ، مختلف تقاضے اور مختلف محرکات واضح ہو جاتے ہیں۔ مجبتاً ان کے پاس ایک معیار ہے جس پر وہ موجودہ سماج، اس کے اخلاق و آداب، اس کے دستور و قوانین کو پرکھتے اور ان کا کھوکھلا پن ثابت کرتے رہتے ہیں۔

میرے ایک عشق پیشہ دوست جو اپنی محبوباؤں کو مختلف شعرا کی نظمیں سنانے اور ان کے پردے میں اپنی قلبی واردات ظاہر کرنے کے خوگر ہیں۔ ایک دن مجھ سے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہنے لگے۔ "تمھاری اس جدید شاعری میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ مجموعے کے مجموعے پڑھ ڈالو کوئی گوں کی نظم نہیں ملتی جو کسی کو سنائی جا سکے۔ لے دے کے ایک ساحر کی کتاب ہے جس میں کچھ مطلب کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ ابھی دو تین دن ہوئے میں نے اپنی محبوبہ کو ان کی ایک نظم لکھ بھیجی تو وہ رونے لگی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساحر نے وہ نظم ہمارے ہی لئے لکھی ہے"

میں اس دعوے کے پہلے جز سے متفق نہیں ہوں لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ ساحر آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دینے کا گر خوب جانتے ہیں، یا یوں سمجھئے کہ ان کے تجربات صرف انھیں کے نہیں ایک دور کے، ایک پود کے تجربات ہیں۔

آج درمیانی طبقہ جن الجھنوں کا شکار ہے ساحر اس کی ترجمانی میں بہت کامیاب ہیں۔

میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنتِ شکیبائی

ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی

ساحر نے یہ صرف اپنی کشمکش، اپنی الجھنوں اور اپنی سراسیمگی کی کہانی نہیں سنائی ہے بلکہ اپنی ذات کو اس ہجوم میں گم کر دیا ہے۔ جس کے سامنے نہ کوئی جادہ ہے نہ منزل ہے۔

میں ساحر کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں وہ جتنے کامیاب شاعر ہیں اتنے ہی اچھے دوست بھی، جو خلوص ان کے فن میں ہے وہی شخصیت میں ہے۔ احساس و تاثر کی جو شدت ان کی نظموں میں ملتی ہے وہ زندگی میں نظر آتی ہے جو بھولا پن ان کے چہرے پر ہے وہی لہجے میں ہے۔

مجھے اکثر یہ سوچنا پڑا ہے کہ میں ساحر کو ان کی شاعری کے رشتے سے عزیز رکھتا ہوں یا ان کی شاعری کو خود ان کے ناطے سے۔ اور یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہونچ سکا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساحر نے اپنی شخصیت کا سارا گداز شاعری میں بھر دیا ہے اور شاعری کی ساری جادوئیت اپنے خط و خال میں جذب کر لی ہے، آئینہ سے آئینہ گر کا ابھرنا لطیفہ ہی سہی، لیکن تلخیاں کا مطالعہ کیجئے تو اس کے مصنف کی روح بولتی دکھائی دے گی، مصنف سے باتیں کیجئے تو معلوم ہو گا کہ آپ اس کی نظمیں پڑھ رہے ہیں۔

سچائی اُن کی اور اُن کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے اگر ان پر یاس کا دورہ پڑتا ہے تو وہ چھپاتے نہیں، اگر ان کے پیروں میں لغزش پیدا ہوتی ہے تو وہ شرماتے نہیں۔

ابھی انھوں نے کوئی بڑی نظم نہیں کہی ہے اور شاید جب تک زندگی میں زاجیت کا عمل ہے وہ کہہ بھی نہیں سکیں گے، وہ دیر تک کسی موضوع پر غور نہیں کر سکتے، دیر تک کسی مجلس میں بیٹھ نہیں سکتے، گھبرا جانا اکتا جانا۔ ساتھ چلتے چلتے آگے بڑھ جانا، پیچھے رہ جانا۔ ان کی خصوصیت ہے۔

ہر چیز کے اچھے اور برے پہلوؤں پر ان کی نظر فوراً پہونچ جاتی ہے لیکن کوئی فیصلہ کرنا یہ ساحر کے بس کا روگ نہیں۔ زندگی کے بڑے بڑے مسائل تو الگ رہے، وہ جلدی یہ نہیں طے کر پاتے کہ کس پتلون پر کون سی قمیص پہنیں۔

یہ منظر ان کے اکثر دوستوں نے دیکھا ہوگا کہ سو کے اٹھنے کے بعد وہ بکس کے پاس جا کے بیٹھ جاتے ہیں اور سارے دھلے ہوئے کپڑے بکس سے نکال کر اپنے ارد گرد پھیلا دیتے اور دیر تک اس قمیص سے وہ پتلون، اس پتلون سے وہ قمیص ملا کر دیکھتے رہتے ہیں۔

ان کی یہ کمزوری کانفرنسوں اور مشاعروں میں اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، مائیکروفون کے سامنے پہونچنے کے بعد اگر مجمع میں سے آوازیں آنے لگیں "ساحر صاحب تاج محل سنائیے"، "ساحر صاحب فن کار سنائیے"

بس ساحر صاحب کے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور اپنی منتخب کی ہوئی نظم فوراً ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔

جن دنوں ساحر لدھیانے سے ہندستان کا منشدر (بمبئی) میں آئے میں لکھنؤ میں تھا، نئی نئی کمپنی اور ان کی نئی نئی ملازمت، لیکن یہاں پہونچتے ہی انھوں نے اپنے ہر ایسے دوست کو جو فلمی دنیا کی سیر کرنا چاہتا تھا بلانا شروع کیا۔ جب میں لکھنؤ سے واپس آیا اور ان سے ملنے گیا تو وہ ایک کمرے بھر دوست جمع کر چکے تھے۔

ساحر کی زندگی میں دوستوں کو بڑا دخل ہے، وہ ایک دن بھی تنہا نہیں رہ سکتے، جہاں جاتے ہیں وہاں کچھ لوگوں کو اپنا پتہ لکھا دیتے ہیں اور ان کا پتہ لکھ لاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر ان کو کچھ کھونا پڑے، کچھ ایثار کرنا پڑے تو کبھی دریغ نہیں کریں گے۔ جب اس طرح بھرتی کی جائے تو بہادر اور بزدل ہر طرح کے رنگروٹ ملیں گے، فلمی دنیا سے تعلق یا دلچسپی رکھنے والوں کے پاس آج کل کافی وقت ہے اور ان میں سے اکثر ساحر کے دوست بن گئے۔ یہ وضعدار دوست تقریباً روزانہ کسی نہ کسی طرف سے گھومتے پھرتے آ کر اس وقت ساحر کا مزاج ضرور پوچھ لیتے ہیں جب وہ کسی ہوٹل میں بیٹھے آملیٹ کھا رہے ہوں۔

بمبئی کے قیام میں ساحر نے نظمیں کم پیسے زیادہ پیدا کئے، مگر اپنے لئے نہیں، ٹیکسی والے کے لئے ——— دوست، ٹیکسی، آملیٹ۔ ساحر کی زندگی میں تین سرخیاں یہ بھی ہیں۔

کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ اگر ساحر شادی کرلیں تو ان کی زندگی میں بڑی حد تک نظم وضبط پیدا ہو جائے۔ یقیناً ہو جائے۔ مگر شادی کرنے کے لئے بھی تو نظم وضبط کی ضرورت ہے۔

پچیس برس کی عمر میں تین چار حادثے تو ایسے ہو چکے ہیں کہ شادیاں ان پر منڈلائیں، منڈلاتی رہیں اور منڈلا کے رہ گئیں مگر ساحر ہر مرتبہ بچ نکلے۔

ہر شے قریب آکے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

اور اسی شوقِ گریزاں نے آخر ساحر کو اس منزل میں پہونچا دیا۔

تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤ گی مجھے
میں تمہارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں
گائے ہیں میں نے خلوصِ دل سے بھی الفت کے گیت
اب ریاکاری سے بھی چاہوں تو گا سکتا نہیں
کس طرح تم کو بنا لوں میں شریکِ زندگی
میں تو اپنی زندگی کا بار اٹھا سکتا نہیں

نجی زندگی کی محرومیوں، شکستوں اور الجھنوں نے ساحر کو اس قدر گھلایا پگھلایا ہے کہ اب ان میں احساس ہی احساس باقی رہ گیا ہے، جس کے تار کسی مدھم سی تحریک سے جھنجھنا اٹھتے ہیں اور ان کا ایک ایک رواں ہر بے انصافی کے خلاف احتجاج کرنے لگتا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کی گھٹی پتی

کا مظاہرہ دیکھ کر وہ تلملا اٹھتے ہیں، چیخ اٹھتے ہیں، جب اجنبی قوم کے بے فکر نوجوانوں کا گروہ، ہندستانی گداگروں کی بھوک سے کھیلتا، لطف اندوز ہوتا ہے اور ہندستانی گداگر ڈبل روٹی کے ایک چھوٹے ٹکڑے پر آپس میں لڑکر ان بے فکروں کے لئے سامانِ تفریح مہیا کرتا ہے، تو ساحر کا احساس، اور ان کا لہجہ شعور کی گرفت سے باہر نکل جاتا ہے اور وہ اپنے منہ کی ساری کڑواہٹ اپنی ذات سمیت اپنے ہم وطنوں کے منہ پر تھوک دیتے ہیں۔

کاش یہ بے حس و بے وقعت و بیدل انساں
روم کے ظلم کی زندہ تصویر
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے
ڈیڑھ سو سال کے پابند سلاسل کتے
اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراجِ قوت

اس محکوم، مجبور اور بھوکے ملک میں جس کی تقدیس اور روحانیت کے نغمے آنکھ بند کرکے گائے جاتے ہیں۔ قدم قدم پر چکلے قائم ہیں، اس لئے ہندستانی ادب میں بھی چکلے ہیں۔

یہاں آپ کی اجازت سے میں اپنی ایک رائے ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ساحر نے ثنا خوانِ تقدیس مشرق کو جس شدت، جس نفرت اور جس خلوص سے جھنجھوڑا ہے اس کی مثال مجھے کسی دوسرے فن پارے میں نہیں ملتی۔

چکلے میں ساحر کی غیرت اس کی روح، اس کے احساس کی تلملاہٹ بلندی کے انتہائی نقطے پر نظر آتی ہے۔

میں یہ نظم جب پڑھتا ہوں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، ساحر نے نہ جانے کس احساس کی کس شدت کے ساتھ یہ نظم لکھی ہے، ان کے لہجے کی مخصوص افسردگی یہاں ایک بے پناہ بہاؤ میں تبدیل ہوجاتی ہے

اس کو چاہے میری خود غرضی کہہ لیجئے، لیکن یہ میری تمنا ضرور ہے، کہ ساحر ایک بار کسی ایسی چٹان سے ٹکرا جائیں کہ ان کی شخصیت پارہ پارہ ہوجائے ان کی صلاحیتوں کو جگانے کے لئے یہ تصادم بہت ضروری ہے۔ یہ میرے اور میری طرح اکثر ساتھیوں کے دیکھے ہوئے مناظر ہوں گے کہ ساحر عام طور سے سمٹے سمٹائے بیٹھے رہتے ہیں، لیکن اگر ان کے رگ حمیت پر کوئی بے دردی کے ساتھ نشتر رکھ دے تو ساحر دیکھتے دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔

وہ پہلی بار جب بمبئی آئے تھے تو کارپوریشن کا الکشن ہونے والا تھا اور کانگریسی رکن کا مقابلہ مزدوروں کے محبوب رہنما کامریڈ بھوگلے کر رہے تھے جو خود بھی مزدور ہیں۔ ہزار دقتوں کے بعد ساحر میرے ساتھ پولنگ اسٹیشن پر گئے، میں وہاں جاکر اپنے کام میں مشغول ہوگیا اور ساحر ایک گنجان درخت کے نیچے لیٹ رہے، اس دن ان کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی۔

پولنگ اسٹیشن پر غنڈوں نے کانگریس کی آڑ لے کر اودھم مچا رکھا تھا، کمیونسٹ رضاکاروں پر پتھر پھینکنا، گالیاں دینا، مزدور ووٹروں پر طرح

طرح کا دباؤ ڈالنا، ساحر یہ تماشا، خاموشی سے نہیں دیکھ سکے، فوراً کمیونسٹ رضا کاروں کی صف میں شامل ہو گئے اور شام کے ساڑھے چھے بجے تک نعرے لگاتے رہے، دوڑتے رہے، کام کرتے رہے اور اس دن انھوں نے نہ آملیٹ کھایا نہ ٹیکسی ہی پر بیٹھے۔

پچھلے دنوں احمد آباد میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس تھی، اور ساحر بدستور اس کانفرنس میں بے دلی کے ساتھ حصہ لے رہے تھے، ایک اجلاس میں کچھ لوگوں نے خلل ڈالنا چاہا۔ بار بار شور مچانا شروع کیا، ساحر جو اب تک ساری دنیا سے روٹھے بیٹھے تھے اچانک جاگ اٹھے اور جب مائیکروفون پر پہونچے تو ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، آنکھیں سرخ ہو کر اور بڑی ہو گئی تھیں۔ اس وقت ساحر نے اپنی نظم طلوع اشتراکیت اتنی آن بان سے سنائی کہ سارا مجمع اُن کے ساتھ بہہ گیا۔

شور مچا ہے بازاروں میں ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے
رسوا بازاری خاتونیں حق نسوانی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں
روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اٹھی ہے
آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
ابھرے جذبے دب نہ سکیں گے اکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے

ایک نیا سورج چمکا ہے ایک نئی ضو باری ہے

ختم ہوئی افراد کی شاہی اب جمہور کی سالاری ہے

میں نے یہ مقالہ آٹھ ماہ پہلے لکھا تھا اور آج ہندستان بدل چکا ہے ساحر بمبئی سے لاہور چلے گئے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان کی تقسیم سے پیدا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے ساحر کے روح اور دل کو بری طرح زخمی کر دیا ہے اور وہ لاہور میں دن رات کام کرنے میں مشغول ہیں۔ ان کی نئی نظموں میں نیا اُبال اور نئی شدت ہے۔ ساحر کی شاعری پر شباب آ رہا ہے۔

مارچ سنہ ۱۹۴۸ء

انتخاب

فن کار

گریز

چکلے

تاج محل

طلوعِ اشتراکیت

لمحۂ غنیمت

میرے گیت تمھارے ہیں

احساسِ کامراں

مفاہمت

فن کار

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
آج دکّان پہ نیلام اُٹھے گا ان کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز
مرے افکار، مری شاعری، میرا احساس

جو تری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پہ اتر آئی ہے
بھوک، تیرے رخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے

دیکھ اس عرصہ گہہِ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
ترے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
ترے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

آج اُن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

گریز

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی
اُن آرزوؤں پہ چھائی ہے گردِ مایوسی
جنھوں نے تیرے تبسم میں پرورش پائی
فریبِ شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جِلا پائی

سکون و خواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دماغ و دل میں ہے وحشت کی کارفرمائی
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لیکے رنگ و رعنائی
سلا گئی تھیں جنھیں تیری ملتفت نظریں
وہ درد جاگ اٹھا پھر سے لے کے انگڑائی
عجیب عالمِ افسردگی ہے رو بہ فروغ
نہ اب نظر کو تقاضا نہ دل تمنائی
تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب
مری اُداس طبیعت ہے سب سے اکتائی
میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی

مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنتِ شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات، بند دریچوں سے بھی گزر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پُر شکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پہ بخشی طویل تنہائی

پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
سسکتے بچوں پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی
وہ پھر جھکا کسی در پر غرورِ برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوتِ حلقۂ زنداں سے ایک گونج اٹھی
اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی
نہیں نہیں مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ
نہیں نہیں مجھے اب تابِ نغمہ پیرائی
مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی

چکلے

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں؟ کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پُر پیچ گلیاں، یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی، یہ سکوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے، یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

تعفّن ہے پُر نیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہوئی اَدھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفّس کی اُلجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے رُوح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پر
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پھولوں کے گجرے، یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

تاج محل

تاج، تیرے لئے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اِس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اُس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی؟

مری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
اَن گِنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُنکے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے
یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسُور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک اِن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

طلوعِ اشتراکیت

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں، اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں

جاگے ہیں افلاس کے مارے، اٹھے ہیں بےبس دکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم، آنکھوں میں بجلی کے شرارے

چوک چوک پر گلی گلی میں سرخ پھریرے لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر سیل صفت امڈے آتے ہیں

شاہی درباروں کے در سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں
شور مچا ہے بازاروں میں، ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے
رُسوا بازاری خاتونیں حق نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں
روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اٹھی ہے
جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکر بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر، ایک بھبکتا شعلہ ہو کر
کاندھوں پر سنگین کدالیں، ہونٹوں پر بے باک ترانے
دہقانوں کے دَل نکلے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے

آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
اُبھرے جذبے دب نہ سکیں گے اُکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے
راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رُکے گا
چند کرائے کے تنکوں سے سیلِ بے پایاں نہ رکے گا
کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں ٹوٹ گئے دل جباروں کے
بھاگ رہے ہیں ظلِّ الٰہی، منہ اترے ہیں غداروں کے
ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضوباری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے

لمحۂ غنیمت

مسکرا، اے زمینِ تیرہ و تار
سر اٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم اُلجھنے لگے

کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار، سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی
آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق

میرے گیت تمہارے ہیں

اب تک میرے گیتوں میں امید بھی تھی پسپائی بھی
موت کے قدموں کی آہٹ بھی، جیون کی انگڑائی بھی
مستقبل کی کرنیں بھی تھیں، حال کی بوجھل ظلمت بھی
طوفانوں کا شور بھی تھا، اور خوابوں کی شہنائی بھی

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دوں گا
مدھم، لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دوں گا

جیون کے اندھیارے پگ پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلے آنچل میں سرخ ستارے بھر دوں گا

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو یہ شعلے خاموش نہ ہونگے
جب تک بے آرام ہو تم، یہ نغمے راحت کوش نہ ہونگے

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے، لوگ مجھے فن کار نہ مانیں
فکر و سخن کے تاجر، میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں
میرا فن، میری امیدیں، آج سے تم کو ارپن ہیں
آج سے میرے گیت تمہارے دکھ اور سکھ کا درپن ہیں

تم سے قوت لیکر، اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا
تم پر پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا
اب سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

احساسِ کامراں

اُفقِ روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضَو
شب کا تاریک جگر چاک ہوا جاتا ہے
تیرگی جتنا سنبھلنے کے لئے رُکتی ہے
سُرخیٔ سیل اور بھی بے باک ہوا جاتا ہے

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسہ نہ کرے
کہنہ زنجیروں کی جھنکاریں نہیں رہ سکتیں

(سویٹ فوجوں کے جرمن سرحد عبور کرنے پر لکھی گئی)

جذبۂ نصرتِ جمہور کی بڑھتی رَو میں
ملک اور قوم کی دیواریں نہیں رہ سکتیں

سنگ و آہن کی چٹانیں ہیں عوامی جذبے
موت کے رینگتے سایوں سے کہو ہٹ جائیں
کروٹیں لے کے مچلنے کو ہے سَیلِ انوار
تیرہ و تار گھٹاؤں سے کہو چھٹ جائیں

سالہا سال کے بے چین شراروں کا خروش
اِک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزمِ آزادیِ انساں بہ ہزاراں جبروت
اِک نئے دور کا آغاز کیا چاہتا ہے

برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر
اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں

سرخ طوفان کی موجوں کو جکڑنے کے لئے
کوئی زنجیرِ گراں کام نہیں آسکتی
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے تلاطم کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی

مفاہمت

نشیبِ ارض پہ ذروں کو مشتعل پا کر
بلندیوں پہ سفید اور سیاہ مل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے تار سِل ہی گئے

جہاد ختم ہوا، دورِ آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجومِ تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شرابِ ہوس کے پیمانے

یہ جشن، جشنِ مسرت نہیں، تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسیں فانوس

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی، تو شراروں کے پھول لائے گی

نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

کتبہ ذوقی